تزکیۂ نفس

آفاتِ علم

(از جناب مولانا امین احسن اصلاحی)

جس طرح کسی سرسبز و شاداب باغ پر کوئی آفتِ ارضی و سماوی نازل ہو جاتی ہے اور وہ تباہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ جس طرح لہلہاتی ہوئی کھیتی کو کوئی روگ لگ جاتا ہے جس سے وہ دفعۃً یا آہستہ آہستہ جھلس جاتی ہے۔ جس طرح ایک عالیشان عمارت نذرِ تغافل ہو جانے کے سبب سے یا کسی زلزلہ کی وجہ سے کھنڈر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک تنومند اور تندرست انسان کسی بیماری کا شکار ہو کر موت کے کنارے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح علم و معرفت کو تباہ کر دینے والی بھی بہت سی بیماریاں ہیں جو اگر اس کی جڑوں کو لگ جائیں تو پھر اس کو ختم کر کے ہی دم لیتی ہیں۔ ان آفتوں میں سے بعض اپنے مزاج کے لحاظ سے جلد اور تیز اثر کرنے والی ہیں اور بعض آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ بعض انفرادی حیثیت سے نمودار ہوتی ہیں۔ بعض وبائی بیماریوں کی طرح پھوٹ پڑتی ہیں۔ بعض عقل اور ذہن کی طرف سے نمودار ہوتی ہیں بعض اخلاق و عمل کی طرف سے بعض محض کاہلی اور بے پروائی سے پیدا ہوتی ہیں۔ بعض جان، مال یا جامع لفظوں میں دنیا کی غیر معمولی محبت کے سبب سے۔ بعض بزدلی، پست ہمتی اور خوف کا نتیجہ ہوتی ہیں اور بعض گھمنڈ، غرور اور خود پسندی اور انانیت کا۔ ان اعتبارات سے ان کے درجہ اور ان کی نوعیت میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے لیکن جہاں تک ان کے اثر اور نتیجہ کا تعلق ہے یہ سب انسان کو علمِ حقیقی کی دولت سے محروم کر دینے کی خاصیت میں بالکل یکساں ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہر انسان جو ایک مرتبہ علم کی نعمت پا کر اس سے محروم ہونے کے لیے تیار نہ ہو ان بیماریوں کی نوعیت اور ان کے علاج کے طریقوں سے اچھی طرح واقف رہے۔ اپنی صحت کی قدر کرنے والا

ایک شخص جتنا اہتمام ان بیماریوں سے واقف رہنے کے لیے کرتا ہے جو اس کی صحت کو برباد کر سکتی ہیں اس سے کہیں زیادہ ضروری علم حقیقی کے ایک قدردان کے لیے ان آفتوں سے باخبر رہنا ہے جو اس کے علم کو غارت کر سکتی ہیں۔ ہر شخص اپنے خزانہ کی حفاظت کا اہتمام اس کی قدر و قیمت کے لحاظ سے کرتا ہے اگر ایک شخص اپنی جسمانی صحت کی حفاظت سے قاصر رہ جائے تو اس سے جو نقصان اس کو پہنچے گا وہ بیشتر اسی دنیا کی زندگی تک محدود رہے گا۔ لیکن اگر ایک شخص علم حقیقی کی نعمت کی حفاظت سے قاصر رہ جائے تو یہ ایک ایسا نقصان ہوگا جس سے اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ان بیماریوں کی اس اہمیت کے سبب سے ہم یہاں ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

غفلت اور بے پروائی | ان بیماریوں میں سب سے زیادہ عام بیماری غفلت اور بے پروائی کی بیماری ہے۔ انسان کا کچھ خاصہ سا ہے کہ جو چیز اس کے پاس موجود ہو اس کی قدر آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں میں کم ہو جاتی ہے اور جس چیز کی قدر کم ہو جائے لازماً اس کے رکھ رکھاؤ میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ اور جب ایک چیز کے رکھ رکھاؤ میں فرق آیا تو پھر ناگزیر ہے کہ اس چیز پر تغافل کا سایہ پڑنا شروع ہو جائے اور پھر آہستہ آہستہ اس پر ایک دن ایسا آئے کہ بالکل ہی عدم کی تاریکی چھا جائے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نسیان کو علم کی سب سے زیادہ عام آفت قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے آفۃ العلم النسیان (علم کے لیے بڑی آفت بھول جانا ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق (جو علم حقیقی کا خزانہ ہے) آپ نے خاص طور پر یہ ہدایت فرمائی ہے کہ لوگ اپنے قرآن سے علم کو برابر تازہ کرتے رہیں تاکہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:۔

تعاهدوا القرآن فانه اشد تفصيا من صدور الرجال من النعم (متفق علیہ)

اپنے علم و قرآن کو برابر تازہ کرتے رہو جس طرح اونٹ غفلت کے سبب سے کھو جاتا ہے اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ قرآن سینوں سے نکل جایا کرتا ہے۔

دوسری روایت میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:۔

مثل صاحب القرآن كمثل صاحب الابل

اس شخص کی مثال جس کے پاس قرآن کا علم ہو اس شخص

المعلقة ان عاهد عليها امسكها وان اطلقها ذهبت۔

کی ہے جس کے پاس بندھنوں میں بندھے ہوئے اونٹ ہوں۔ اگر وہ ان کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے تو وہ محفوظ رہتے ہیں اور اگر وہ ان سے غافل ہو جاتا ہے تو پھر وہ کہیں کے کہیں چل دیتے ہیں۔

یعنی علم کے لیے صرف ایک مرتبہ حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو حاصل کر لینے کے بعد بار بار اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا بھی ضروری ہے ورنہ اس کی مثال ایسی ہو گی کہ ایک شخص کسی دور دراز ولایت سے صرف کثیر اور اہتمام و انتظام کی تمام زحمتیں جھیل کر ایک قیمتی پودا منگوائے لیکن منگوا چکنے کے بعد پھر اس کی خبر نہ لے کہ وہ کس حال میں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو پودا جس قدر قیمتی ہوتا ہے وہ اسی قدر رکھ رکھاؤ اور اہتمام کا طالب ہوتا ہے اور اگر یہ چیز اس کو حاصل نہ ہو سکے تو پھر اس کا نشو و نما پانا تو درکنار اس کا محفوظ رہنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہی حال علم حقیقی کا ہے۔ جہاں تک اس کے حاصل ہونے کا تعلق ہے اس کا راستہ ہر طالب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ جس طرح آسمان سے بارش برستی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اپنی یہ سب سے بڑی نعمت بھی برسائی ہے اور اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کے صالح بندوں نے اس نعمت کے تقسیم کرنے میں تاریخ کے کسی دور میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور اس علم کو بقدر استعداد پایا بھی بہتوں نے ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی دیکھ بھال اور اس کے رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں بہت تھوڑے ہی پورے اترے ہیں اور درحقیقت یہی تھوڑے سے پورے اترنے والے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ یاب ہوئے ہیں ورنہ بہتوں کے لیے، جیسا کہ بعض حدیثوں میں فرمایا گیا ہے، یہ علم مفید ہونے کے بجائے ان کے خلاف ایک حجت ہی ثابت ہوا ہے۔

یہی سبب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کے لیے خاص اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید کی بعض آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبرائیل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی آیتیں سناتے تو آپ اس اندیشہ سے کہ کوئی چیز یاد کرنے سے رہ نہ جائے اس کو بار بار دہراتے اور اس کو اچھی طرح محفوظ کرنے کی کوشش فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فکر سے فارغ کر دینے کے لیے

قرآن مجید کو جمع کرنے اور اس کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری خود لے لی اور آپ کو ان الفاظ میں تسلی دی :۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ - فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (سورہ قیمہ)

تم اس کو (قرآن کو) جلد حاصل کر لینے کے لیے اس پر اپنی زبان نہ چلاؤ۔ ہماری ذمہ داری ہے اس کو محفوظ کرنا اور اس کو سنانا۔ سو جب ہم اس کو سنائیں تو تم اس سنانے ہوئے کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اسکی وضاحت کرنا

یہ قرآن کو محفوظ رکھنے کا مقصد ہی ہے جس کی وجہ سے اس کو ایسے اسلوب میں ڈھالا گیا کہ اس کو یاد رکھنا آسان ہو اور پھر اس کی بار بار تلاوت کا حکم دیا گیا اور پنجوقتہ نمازوں میں اس کی تلاوت کو ضروری قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں رمضان کی راتوں میں خاص اہتمام کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لیے یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ٹھہرایا گیا کہ مساجد میں قرآن پڑھا جائے اور عام لوگ اس کو سنیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرض اور نفل نمازوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی قرآن کی تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ یہی حال صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا۔ قرآن کا جتنا جتنا حصہ اترتا جاتا اور جس جس کو پہنچایا جاتا وہ اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا۔ یہ اہتمام صرف قرآن کے الفاظ ہی کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ الفاظ سے زیادہ اس کے معانی و مطالب کے محفوظ کرنے کے لیے صحابہؓ میں سرگرمی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ صحابہؓ اپنے زمانہ میں مختلف علمی مجلسیں قائم کرتے تھے جن میں قرآن مجید کے معانی و مطالب اور اس کے اسرار و حقائق پر گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ ان حلقوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی شرکت فرماتے تھے اور تحقیق قرآنی کی ان مجلسوں کو آپ ذکر و عبادت کی مجلسوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

قرآن اور علوم نبوی کو محفوظ کرنے کا یہی ذوق و شوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کے زمانوں میں بھی باقی رہا۔ خلفائے راشدین خود اس دلچسپی کو بڑھانے میں حصہ لیتے رہے خصوصیت کے ساتھ حضرت عمرؓ نے اس خدمت میں جو حصہ لیا اس کے ذکر سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے علم کے لیے حفاظت کا یہ اہتمام پچھلی امتوں کے زمانوں میں نہ ہو سکا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا اور یہ امتیں اللہ تعالیٰ کی روشنی پانے کے بعد

ان سے محروم ہو گئیں۔ چنانچہ یہود کا جو حال ہوا اس کی مثال قرآن نے یہ دی ہے :۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۔ (۱۷ ۔ بقرہ)

ان کی مثال بالکل اس شخص کی ہے جس نے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے ارد گرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی اچک لی اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا جہاں ان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

انہی یہود کے متعلق فرمایا ہے کہ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِنْهُمْ (۱۳ ۔ مائدہ) "اور جس چیز کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ انہوں نے فراموش کر دیا اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے مطلع ہوتے رہو گے"

اسی طرح نصاریٰ کے متعلق قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے علم کا ایک حصہ اپنی ناقدری اور بے پروائی کے سبب سے فراموش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان اختلاف اور جھگڑے کی مستقل بنیادیں قائم ہو گئیں جن کے رفع ہونے کی اب ان کے پاس کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ گئی۔

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (۱۴ ۔ مائدہ)

اور ان لوگوں سے جنہوں نے کہا کہ ہم نصرانی ہیں ہم نے ان کا عہد لیا تو وہ بھلا بیٹھے ایک حصہ اس چیز کا جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی تو ہم نے ان کے درمیان دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی قیامت تک کے لیے۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی دوسری چیز جو علم حقیقی سے محروم کرنے والی ہے وہ خواہشاتِ نفس کی پیروی ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح اتباعِ ہوا ہے۔ اتباعِ ہوا کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کی تکمیل، اپنی خواہشات کے حصول، اپنی شہوات کی تسکین اور اپنے جذبات کی تسلی کے سوا اور کسی چیز سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ ان کے سوا اس کے سامنے زندگی کا کوئی اور اعلیٰ اور بلند تر

مقصد نہ رہ جائے۔ وہ انہی چیزوں کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھ بیٹھے اور اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں اور اپنے تمام ذرائع و وسائل بس انہی کی خدمت اور مقصد براری میں لگا دے۔ ان کی لذتیں اور ان کے نفد منافع اس کو اس طرح مسحور کر لیں کہ اس کو یہ سوچنے کا کبھی موقع ہی نہ مل سکے کہ ان کے سوا کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے جو چاہی جا سکتی ہے اور یہ زندگی اس کے حاصل کرنے کا بھی ذریعہ بن سکتی ہے۔

اس اتباعِ ہوا کا ایک مرحلہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات و شہوات کی تعمیل میں اس قدر آگے بڑھ جائے کہ زندگی کے اندر وہ ان کے سوا یا تو کسی اور اعلیٰ اصول اور برتر قدر کا قائل ہی سرے سے نہ رہ جائے اور اگر قائل رہے بھی تو اپنے ان نفسانی مطلوبات کے حصول میں ان کا حارج ہونا کسی طرح گوارا نہ کرے۔ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے جب اٹھے تو اس چیز سے بالکل آنکھیں بند کر کے اٹھے کہ حرام و حلال اور ظلم و انصاف کے کچھ معروف ضابطے بھی ہیں جن کا اس کو احترام کرنا ہے۔ جب اس کے اوپر شہوت کا بھوت سوار ہو تو وہ صرف اس بات پر نگاہ رکھے کہ اس کی یہ شہوت کی آگ بجھتی کس طرح ہے، اس سے بالکل قطع نظر کر لے کہ اس کے لیے خدا اور رسول نے کچھ ضابطے بھی مقرر کیے ہیں جن سے تجاوز کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ جب اس پر کوئی جذبہ غالب آ جائے تو وہ اس کے تقاضوں کی رَو میں بہہ جانے کے لیے اپنے آپ کو اس کی موجوں کے حوالہ کر دے اس سے اسے کچھ بحث نہ رہے کہ یہ جذبہ بُرا ہے یا اچھا اور اس کے اندر اعتدال اور بے اعتدالی کی حدیں کیا ہیں۔ الغرض وہ ایک نرا حیوان بن جائے اور حیوانوں ہی کی طرح اپنی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کرے، بس اگر کچھ فرق رہ جائے تو یہ کہ حیوانات کے لیے کچھ جبلّی حدود ہوتے ہیں جن کی پابندی پر وہ مجبور ہوتے ہیں اس وجہ سے کسی راہ میں بھی قدرت کی مقرر کی ہوئی ایک متعین حد سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے اور یہ ایک خود مختار مخلوق ہونے کی وجہ سے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں جس قدر آگے بڑھنا چاہے بڑھتا چلا جائے۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

اس اتباعِ ہوا کا دوسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ آدمی صرف حلال و حرام کے حدود توڑنے ہی پر

قناعت نہ کرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اس قدر اندھا ہو جائے کہ ان کی خاطر تمام اقدار کو بدل ڈالنے کے درپے ہو جائے۔ اس کی کوشش یہ ہونے لگے کہ معروف منکر بن جائے اور منکر معروف کی جگہ حاصل کرلے۔ جو چیز اب تک نیکی سمجھی گئی ہے وہ بدی سمجھی جانے لگے اور جو بدی ہے وہ نیکی کی حیثیت اختیار کرلے۔ قوم کی روایات، قوم کی تہذیب، اور قوم کے سارے معیارات یک قلم تلپٹ ہو جائیں۔ دین و مذہب کے نام سے جو چیز موجود ہے اس کا اصل تو خاتمہ ہو جائے لیکن اگر خاتمہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کی وہ چیزیں جو کسی پہلو سے نفس کی آزادیوں میں خلل انداز ہوتی ہیں مٹا دی جائیں۔ ان میں سے بعض کو ملائیت اور دقیانوسیت کہہ کر ختم کر ڈالا جائے، کچھ پر تحریف کی قینچی چلا دی جائے۔ کچھ پر تاویلِ باطل کی سیاہی پھیر دی جائے۔ صرف انہی چیزوں کو باقی رہنے دیا جائے جو نفس کی خواہشوں کے مطابق ہیں یا کم از کم ان سے متصادم نہیں ہیں۔

انسان کی یہ کوشش اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی میں اس قدر بے بس ہو جاتا ہے کہ وہ اس بات کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں رہ جاتا کہ کسی گوشہ سے اس کے کانوں میں ملامت کی کوئی آواز پڑے۔ اسی وجہ سے وہ یا تو ان ساری چیزوں کو مٹا دیتا ہے جو اس کے نفس کو کھٹکتی ہیں یا ان کو تاویل و تحریف کے پردوں میں چھپا دیتا ہے تاکہ ان کے سبب سے اس کی نفس پرستی کی آزادی میں اس کا ضمیر کوئی خلش نہ محسوس کرے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کتر بیونت اور اتنی کاٹ چھانٹ کے بعد مذہب کا کچھ حصہ ان کی زندگیوں کے کسی گوشہ میں اگر بچ رہتا ہے تو اس وجہ سے نہیں بچ رہتا ہے کہ وہ مذہب کا حصہ ہے، یا خدا نے اپنی کتاب میں اس کی تعلیم دی ہے، یا رسول نے اپنے قول اور فعل سے اس کو قائم کیا ہے۔ بلکہ اس کے بچ رہنے کی واحد وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ چیز ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی ہے یا کم از کم یہ کہ ان کے خلاف نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث کی کسی بات کو اس لیے ماننا کہ یہ ہماری خواہشوں کے مطابق ہے یہ قرآن و حدیث اور اللہ اور رسول کو ماننا نہیں ہے بلکہ یہ محض اپنی خواہشوں کی پرستش ہے۔ خدا اور رسول کے ماننے کے لیے تو یہ لازمی ہے کہ ان کی ہر بات مانی جائے خواہ وہ ہماری خواہشوں کے مطابق ہوں یا ان کے خلاف۔

بلکہ ایمان کا حقیقی تقاضا تو خواہشوں کے خلاف ماننے ہی سے پورا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشیں میرے لائے ہوئے علم کے تابع نہ بن جائیں"۔

انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی بنائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں طرح کے رجحانات ودیعت کر دیئے ہیں۔ جہاں تک اس کی مادی ضروریات و خواہشات کا تعلق ہے وہ تو اس کو پوری طاقت کے ساتھ نفع عاجل اور لذتِ عاجل کی طرف کھینچتی ہیں اور اس کو ہرگز اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ان کی تکمیل کی راہ میں کسی قسم کی اخلاقی قید و بند کو حائل ہونے دے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر کچھ روحانی تقاضے بھی ہیں جو اس کے ہر غلط اقدام پر اس کو ٹوکتے ہیں اور اس کی نفسانی خواہشوں کے علی الرغم اس کو نیکی، انصاف اور حق پرستی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف کھینچتے ہیں۔ انسان کی نفسانی اور روحانی کشمکش کا یہی وہ مرحلہ ہے جس میں انسان کی دستگیری اور رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے انسان کو علمِ حقیقی کی روشنی عطا فرمائی ہے اور اس علمِ حقیقی کو "العلم" کی اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں رکھی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام مراحل میں "ہوا" کی پیروی کرنے کے بجائے اس "العلم" کی پیروی کرے۔ اور اگر وہ اس "العلم" کے ہوتے ہوئے اپنے "اہواء" یعنی اپنی خواہشات، اپنے من گھڑت نظریات و افکار اور اپنے جی سے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط کی (جو العلم کے خلاف ہوں) پیروی کرتا ہے تو وہ اس قانون کی مخالفت کرتا ہے جو فاطر السمٰوات والارض نے انسان کی فلاح و نجات کے لیے بنایا ہے اور اس صورت میں اس کو خدا کے قانون کی مخالفت کے بُرے انجام سے کوئی طاقت بھی نہیں بچا سکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید کی یہ آیت واضح کر رہی ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ	اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے بعد اس کے کہ تمہارے پاس "العلم" آ چکا ہے تو اللہ کے مقابل میں

وَلَا وَاقٍ (۳۷ - رعد) کوئی تمہارا کارساز اور بچانے والا نہیں بن سکے گا۔

اس "العلم" اور "ہوا" کی طبیعت میں ہر اعتبار سے بالکل تضاد ہے۔ ایک کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے اور دوسرے کا منبع انسان کا اپنا نفس۔ ایک ہمیشہ انسان کو ابدی زندگی کی بلندیوں کی طرف بڑھنے کے لیے اشارہ کرتا ہے اور دوسری چیز اس کو اسی زندگی کی فانی لذتوں کی کیچڑ میں لت پت رکھنا چاہتی ہے۔ ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان مادی خواہشوں اور لذتوں کی تنگ نائے سے نکل کر روحانی کمالات کے حاصل کرنے کے لیے پرواز کرے لیکن دوسرے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انسان اسی زمین کا کیڑا بنا رہے۔ اس کوشش اور خواہش میں کچھ عرصہ تک کشمکش رہتی ہے بالآخر یہ کشمکش اس وقت ختم ہوتی ہے جب انسان ان میں سے کسی ایک کو مستقلاً اپنے لیے انتخاب کر لیتا ہے۔ اگر وہ برابر "العلم" کے مقابل میں "ہوا" ہی کو ترجیح دیتا ہے، بلندیوں پر چڑھنے کے بجائے پستیوں ہی میں گرے ہوئے رہنے کو پسند کرتا ہے، اور خدا کے بجائے اپنے نفس اور اس کی خواہشوں ہی کی رہنمائی پر اعتماد کرتا ہے اور اس پر ضلالت اور رذالت اس قدر غالب آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شر سے خیر کی طرف اور بدی سے نیکی کی طرف موڑنے کے لیے عسر اور یسر اور رنج و راحت کے جو امتحانات رکھے ہیں ان سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ دونوں ہی صورتوں میں کتے کی طرح زبان نکالے ہی رہتا ہے تو ایسے لوگوں سے "العلم" کی نعمت سلب ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خواہشوں اور لذتوں کے حوالہ کر دیتا ہے کہ وہ ان کے پیچھے جن جن وادیوں میں بھٹکنا چاہتے ہیں اچھی طرح بھٹک لیں۔ قرآن مجید نے اسی صورتِ حال کی تصویر ایک تمثیل کے ذریعہ سے پیش کی ہے اور دیکھیے کس قدر جامع اور خوبصورت تمثیل ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۚ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ

اور ان کو سرگذشت سناؤ اس شخص کی جس کو ہم نے اپنی آیتیں عنایت کی تھیں لیکن ان سے وہ بالکل کنارہ کش ہو گیا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ پس وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کے ذریعہ سے اس کو بلند کرتے لیکن وہ برابر پستی ہی کی طرف

تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۔ (۱۷۶۔ الاعراف)

جھکا رہا اور اس نے اپنی خواہشوں ہی کی پیروی کی پس اس کی مثال بالکل کتے کی مثال ہے اگر تم اس کو ڈانٹو ڈپٹو جب بھی اپنی زبان نکالے رکھے گا اور اگر چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ نے یہود کی مثال بیان کی ہے جن کو "العلم" کی روشنی عطا ہوئی تھی لیکن انہوں نے اس روشنی کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان ان کے پیچھے لگ گیا اور اس نے ان کو بالکل ہی ایمان سے محروم کر کے چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ ان آیتوں کی کمند کا سہارا لے کر روحانی بلندیوں کے مقامات طے کرنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کریں لیکن وہ برابر اپنی ہوائے نفس ہی سے چمٹے رہے اور اس قدر پست ہمت اور ذلیل ہو گئے کہ نہ خدا کی تنبیہات نے ان پر کچھ اثر ڈالا اور نہ اس کی عنایات نے۔ بالآخر جب وہ اس قدر ذلیل اور پست ہمت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے "العلم" کی روشنی ان سے چھین لی اور ان کو ان کے نفس کے حوالہ کر دیا۔

عدم احتساب | علم حقیقی کو برباد کرنے والی آفتوں میں سے ایک بہت بڑی آفت عدم احتساب بھی ہے۔ عدم احتساب کے معنی یہ ہیں کہ آدمی نیکی اور بدی اور حق اور باطل کے معاملہ میں بالکل بے تعلق ہو کے رہ جائے۔ اسے اس سے کچھ بحث ہی نہ رہ جائے کہ دنیا نیکی کی طرف جا رہی ہے یا بدی کی طرف، خیر کی طرف بڑھ رہی ہے یا شر کی طرف، معاشرہ بگڑ رہا ہے یا بن رہا ہے۔ وہ یا تو یہ نظریہ قائم کر لے کہ یہ پرائے جھگڑے ہیں اور پرائے جھگڑے نمٹانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے یا فضا کی خرابی اور حالات کی ناسازگاری اس کو اس قدر پست ہمت اور بزدل بنا دے کہ صریح سے صریح انحراف کو دیکھ کر بھی اس کی زبان سے کلمۂ حق نہ نکلے۔ اگر کسی قوم کے اندر حاملینِ علم کی اکثریت یا ان کی پوری جماعت یہی روش اختیار کر لے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس قوم پر باطل کی تاریکی چھا جاتی ہے اور وہ علم حقیقی کے نور سے بالکل ہی محروم ہو جاتی ہے۔

کسی معاشرے کے اندر جس وقت خرابی کا آغاز ہوتا ہے تو یہ خرابی زیادہ طاقتور نہیں ہوتی۔ اگر اسی مرحلہ

میں معاشرے کے ذمہ دار لوگ اس کے احتساب کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور برائی کے ذمہ داروں کو مناسب تنبیہ ہو جائے تو اس کے مزید پھیلنے کے امکانات کا سدباب ہو جاتا ہے لیکن اگر اس سے تغافل برتا جائے تو آہستہ آہستہ وہی معمولی سی برائی جڑ پکڑ لیتی ہے اور پھر اس کے برگ و بار اس قدر پھیل جاتے ہیں کہ ان پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا ہے ؎

سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

اس احتساب کے لیے قرآن کی معروف اصطلاح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہے۔ اگر اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے غفلت کی جائے تو اس کے نتائج کا پہلا مرحلہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ معروف منکر اور منکر معروف کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اس کا دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ طبیعتیں مسخ ہو کر بدی کے سانچہ میں اس طرح ڈھل جاتی ہیں کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذمہ دار تھے وہ علانیہ بدی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے لگ جاتے ہیں۔ اس کا تیسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ علم حقیقی کی روشنی بالکل ہی غائب ہو جاتی ہے اور تمام معاشرے پر ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے علم رکھنے والوں کی عقل بھی چکر کھا جاتی ہے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس فتنہ سے بھاگ کے کہاں جائیں اور کیا کریں۔ ان تمام مراحل کی تصویر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر کھینچ دی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کیف انتم اذا طغیٰ نساءکم وفسد شبابکم وترکتم جہادکم؟ قالوا وان ذالک لکائن یا رسول اللہ؟ قال نعم والذی نفسی بیدہ واشد منہ سیکون۔ قالوا وما اشد منہ یا رسول اللہ؟ قال کیف انتم اذا لم تامروا بالمعروف وتنہوا عن المنکر؟ قالوا

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہاری عورتیں بے قابو ہو جائیں گی، تمہارے نوجوان بدچلن ہو جائیں گے اور تم جہاد چھوڑ بیٹھو گے؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ آنے والا ہے۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ

او کائن ذالك یارسول اللہ ؟ قال نعم والذی نفسی بیدہ واشد منہ سیکون۔ قالوا وما اشد منہ؟ قال کیف انتم اذا رأیتم المعروف منکرا والمنکر معروفا، قالوا او کائن ذالك یارسول اللہ ؟ قال نعم والذی نفسی بیدہ واشد منہ سیکون، قالوا وما اشد منہ ؟ قال کیف انتم اذا امرتم بالمنکر ونہیتم عن المعروف۔ قالوا او کائن ذالك یارسول اللہ قال نعم والذی نفسی بیدہ واشد منہ سیکون، یقول اللہ تعالیٰ بی حلفت لاتیحن لھم فتنۃ یصیر الحلیم فیھا حیران۔

اس سے زیادہ سخت مرحلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کا حکم دوگے اور نہ برائی سے روکوگے؟ لوگوں نے کہا یارسول اللہ کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپنے فرمایا ہاں، اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے اس سے بھی سخت مرحلہ سامنے آنے والا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا یارسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ آپنے فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم دیکھوگے کہ معروف منکر بن گیا ہے اور منکر معروف بن گیا ہے؟ لوگوں نے کہا یارسول اللہ یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپنے فرمایا ہاں، اور اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ آنے والا ہے۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم برائی کا حکم دوگے اور بھلائی سے روکوگے۔ لوگوں نے کہا یارسول اللہ کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپنے فرمایا ہاں، اور اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت وقت آنے والا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ اس وقت میں ان کے لیے ایسا فتنہ برپا کروں گا کہ بڑے بڑے دانشور بھی چکر میں پڑ جائیں گے۔

اس حدیث سے وہ پوری تدریج سامنے آجاتی ہے جس تدریج سے احتساب کے فرض سے غفلت نمایاں ہوتے ہی فتنہ کی تاریکی برسنی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس طرح چھا جاتی ہے کہ بڑے بڑوں کو بھی نیکی اور سچائی کی راہ سوجھائی نہیں دیتی اور آنکھیں رکھنے والے بھی اندھے بن جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا مضمون کی تائید بعض دوسری حدیثوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف و لتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عذابا من عندہ ثم لتدعنہ ولا یستجاب لکم (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یا تو تم نیکی کا حکم دوگے اور برائی سے روکوگے یا یہ ہوگا کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے ایک عذاب بھیجے گا، پھر تم اس کو پکاروگے لیکن تمہاری سنی نہیں جائے گی۔

ایک دوسری حدیث میں یہی حقیقت ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوئی ہے۔

ما من قوم یعمل فیہ بالمعاصی ثم یقدرون علی ان یغیروا ثم لا یغیرون الا ان یوشک ان یعمہم اللہ بعقاب۔

جس قوم کے اندر برائی پھیل رہی ہو اور اس کے اندر ایسے لوگ ہوں جو اس کی اصلاح کر سکتے ہوں لیکن وہ اصلاح نہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقت قریب آلگا ہے جب اللہ تعالیٰ ان سب کو کسی عذاب میں پکڑے۔

ایک حدیث جو ٹھیک ٹھیک قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر ہے اس حقیقت کو یوں واضح کر رہی ہے۔

ان اللہ تعالیٰ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروا فاذا فعلوا ذالک عذب اللہ العامۃ والخاصۃ۔

اللہ تعالیٰ تھوڑے سے بُرے لوگوں کے بُرے اعمال کی پاداش میں دوسروں کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک یہ بات نہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے درمیان برائی کو پھیلتے ہوئے دیکھیں اور وہ اس کے خلاف آواز اٹھانے پر قادر بھی ہوں لیکن وہ آواز نہ اٹھائیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے بروں اور بھلوں سب کو سزا دے دیتا ہے۔

اس باب میں سب سے زیادہ اہم حدیث ذیل کی حدیث ہے جو نہایت واضح طور پر کھول دیتی ہے کہ اگر کسی قوم کے اہلِ علم احتساب کے فرض سے غافل ہو جاتے ہیں یا محض منافقانہ قسم کے احتساب پر قانع ہو جاتے ہیں تو کس طرح اللہ تعالیٰ ان کو علم و ایمان کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔

لما وقعت بنوا سرائیل فی المعاصی نہتہم علماءھم فلم ینتہوا فجالسوھم فی مجالسھم واکلوھم وشاربوھم فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض فلعنھم علی لسان داؤد وعیسیٰ ابن مریم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہونے لگے تو ان کے علماء نے شروع شروع میں ان کو روکا لیکن جب وہ باز نہ آئے تو بالآخر انہوں نے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک گروہ کے دلوں کی سیاہی دوسروں کے دلوں پر تھوپ دی اور حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی زبان سے ان پر لعنت کر دی گئی۔

بدعت علم حقیقی کو برباد کرنے والی چیزوں میں سے ایک چیز بدعت بھی ہے۔ بدعت کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز اللہ کے دین میں نہیں ہے اور نہ اس کے مزاج سے کوئی مناسبت ہی رکھتی ہے اس کو دین میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ شریعت میں اصل و اساس کی حیثیت صرف اس چیز کو حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طریق پر ثابت ہے۔ اس کے بعد شریعت کے اندر اگر کسی چیز کو سمجھا جا سکتا ہے تو اس چیز کو سمجھا جا سکتا ہے جو مذکورہ اساسات سے مستنبط ہوتی ہو یا کم از کم ان کے اشارات سے سمجھی جاتی ہو۔ ان کے علاوہ کوئی ایسی چیز دین میں لا داخل کرنا جو نہ دین کے کسی اصول ہی سے نکلتی ہو اور نہ اس کے مجموعی نظام ہی سے کوئی جوڑ رکھتی ہو، صریحاً بدعت ہے۔ بالخصوص جس چیز کے بارہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت موجود ہو اس میں محض اپنے ذوق اور اپنی ایجاد سے کوئی اضافہ کرنا یا اس سنت کا بدل پیدا کرنا بدعت کی نہایت ہی مکروہ قسم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی تمام دینی ایجادات کے بارہ میں یہ جامع حکم دیا ہے:۔

من احدث فی امرنا ھٰذا مالیس

جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز لا داخل کی جو

منه فهو رد - (متفق علیہ) اس سے جوڑ نہیں رکھتی تو ایسی شے مردود ہے۔

بعض احادیث میں آپ نے بدعت کی تردید فرماتے ہوئے علم دین کے بنیادی ماخذوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان سے ہٹ کر کوئی چیز دین میں پیدا کرنے کی کوشش کرنا بدعت ہے۔ اگر کوئی چیز ان کے اشارات سے نکل رہی ہو یا ان کے حدود کے اندر داخل ہو یا وہ زندگی کے اس دائرہ سے تعلق رکھنے والی ہو جس کو اسلام نے ہماری اپنی صواب دید پر چھوڑا ہے تو وہ چیز بدعت نہیں کہلائے گی۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ - (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

آپ نے ارشاد فرمایا بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمدؐ کا طریقہ ہے اور بدترین چیزیں وہ ہیں جو ان کے اندر ان سے بے جوڑ نئی پیدا کی جائیں اور ہر ایسی بدعت گمراہی ہے۔

اس بدعت کی سب سے زیادہ بری قسم یہ ہے کہ کسی جاہلی فکر و فلسفہ، کسی غیر اسلامی طور طریقہ، اور کسی کافرانہ رنگ ڈھنگ کو اسلام کے عقائد و ایمانیات یا اس کے نظام معیشت و معاشرت یا نظام تہذیب و تمدن میں گھسانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

ابغض الناس الی اللہ ثلاثۃ:- ملحد فی الحرم ومبتغ فی الاسلام سنۃ الجاھلیۃ ومطلب دم امرء مسلم لیھریق دمہ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین شخص سب سے زیادہ قابل نفرت ہیں۔ ایک وہ جو حرم کے اندر کسی بے دینی کا ارتکاب کرے دوسرا وہ جو اسلام کے اندر جاہلیت کے کسی طریقہ کو گھسانے کی کوشش کرے، تیسرا وہ جو کسی مسلمان کی جان کے درپے ہو تاکہ اس کا خون بہائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ ہر بدعت جو ایجاد کی جاتی ہے وہ کسی نہ کسی سنت کو ضرور ڈھاتی ہے اور جب کوئی قوم سنت کی جگہ بدعت کو پسند کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سنت کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع

جس قوم نے بھی کوئی بدعت ایجاد کی تو اسی کے مانند اس کے

مثلها من السنۃ ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ احمد) اندر سے سنت اٹھالی گئی۔

تحریف بدعت کے بالمقابل علم حقیقی کو تاراج کرنے والی دوسری چیز تحریف ہے۔ بدعت میں غالب پہلو یہ ہے کہ جو چیز دین کی نہیں ہے اس کو دین میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ اور تحریف میں غالب پہلو یہ ہے کہ جو چیز دین کی ہے، اپنے اغراض و خواہشات کے خلاف ہونے کے سبب سے اس کو دین سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ علم حقیقی پر یہ آفت متعدد شکلوں میں نازل ہوتی ہے۔

اس کی ایک عام اور معروف شکل تو یہ رہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام کی ایسی من مانی تاویلیں کی جائیں جو اس کلام سے دُور کا بھی کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں۔ الفاظ، قواعد زبان، سیاق و سباق، نظائر و شواہد اور خود متکلم کے دوسرے اقوال و ارشادات چیخ چیخ کر اس تاویل سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہوں لیکن محض اپنی خواہشات نفس کی اتباع میں اس تاویل کو کلام الٰہی پر یا کلام رسول پر چپکنے کی کوشش کی جائے۔

اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ تاویل و تفسیر کے تکلف میں پڑنے کے بجائے سرے سے اس چیز ہی کو بدل ڈالا جائے جو امر حق کی طرف رہنمائی کے لیے نشان راہ کا کام دے رہی ہے نفی کو اثبات، شک کو یقین، زید کو بکر اور دن کو رات بنا کر اصل حقیقت کی اس طرح قلب ماہیت کر دی جائے کہ اس کو پہچاننا محال یا تقریباً محال ہو جائے۔

اس کی تیسری شکل یہ ہے کہ لفظ یا فقرے کو قرأت اور طرز ادا کے تصرفات سے اس طرح بدل دیا جائے کہ وہ جس حقیقت کی طرف رہنمائی کے لیے وضع ہوا تھا اس سے ہٹ کر ایک بالکل ہی مختلف سمت میں مڑ جائے۔ تحریف کی مذکورۂ بالا تینوں شکلوں کی طرف قرآن مجید نے یہود کے حالات بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ ۔	الفاظ کو ان کی جگہوں سے ہٹاتے ہیں اور انہوں نے اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر دیا جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے۔

دوسری جگہ ہے :-

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ

اور یہودیوں میں سے وہ بھی ہیں جو کلمات کو ان کی جگہوں سے ہٹاتے ہیں اور کہتے ہیں "سمعنا وعصینا" اور "اسمع غیر مسمع" اور "راعنا" اپنی زبانیں مروڑ کر اور دین کی توہین کے لیے۔

یہود و نصاریٰ کے اندر تحریف کی یہ تینوں قسمیں پائی جاتی تھیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو علم حقیقی کی روشنی سے بالکل ہی محروم کر دیا۔ مسلمانوں کے اندر جو گمراہ فرقے اُٹھے وہ تحریف کی پہلی اور دوسری قسم پیدا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب و سنت کی لفظی تحریف میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر خاص فضل ہے۔

کتمان حق | اسی سلسلہ کی ایک اہم چیز کتمان حق بھی ہے۔ کتمان حق کا مفہوم یہ ہے کہ ایک امر کو جانتے ہوئے اور اس کے اظہار کی ضرورت موجود ہوتے ہوئے کسی طمع یا خوف کے سبب سے اس کے اظہار سے گریز کیا جائے۔

حق کی شہادت دینا اس امت کا حقیقی فرض منصبی ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دین اور اس کے آئے ہوئے علم کو صحابہؓ کو پہنچایا اسی طرح اس امت کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائیں۔

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

اسی طرح ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی ایک امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے سامنے حق کی گواہی دو اور رسول تمہارے سامنے گواہی دے۔

اسی فریضہ کی ادائیگی کا مطالبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے ان الفاظ میں فرمایا ہے :-

بلّغوا عنی ولو اٰیۃ

تم میری طرف سے لوگوں کو علم حق پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہی سہی۔

اسی حقیقت کی طرف حضور نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے :-

نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا واداھا۔

اللہ تعالیٰ اس بندے کے چہرے کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اس کو یاد کیا اور محفوظ رکھا اور لوگوں کو پہنچایا۔

اور جو لوگ علم رکھتے ہوئے اس کو چھپاتے ہیں ان کو حضور نے یہ وعید سنائی ہے۔

من سئل عن علم علمہ ثم کتمہ الجم یوم القیمۃ بلجام من نار۔

جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا ہے لیکن اس نے چھپائی تو اس کو قیامت کے دن آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

اس فرض سے عموماً دو چیزیں مانع ہوتی ہیں۔ ایک طمع، دوسری خوف۔

آدمی ان لوگوں کے سامنے اظہارِ حق سے لازماً جھجکتا ہے جن سے اس نے کوئی طمع وابستہ کر رکھی ہو۔ ایسوں کے سامنے دین کی وہ باتیں تو کہی جاتی ہیں جو ان کو پسند ہوں، یا کم از کم انکو انسے اختلاف نہ ہو۔ لیکن وہ باتیں کہنا جو ان کی خواہشوں کے خلاف ہوں اور جن سے ان کی بداعمالیاں بے نقاب ہوتی ہوں، کم از کم اس شخص کے لیے ناممکن ہے جو ان سے اپنی کوئی دنیوی غرض رکھتا ہو۔ حضرت کعب احبار نے حضرت عمرؓ کے ایک سوال کے جواب میں اسی حقیقت کو یوں آشکارا کیا ہے۔

ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال لکعب من ارباب العلم قال الذین یعملون بما یعلمون قال فما اخرج العلم من قلوب العلماء قال الطمع (مشکوٰۃ بحوالہ دارمی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب سے پوچھا کہ اہل علم کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ علم کو علماء کے سینوں سے نکالا کس چیز نے؟ انہوں نے جواب دیا لالچ نے۔

یہی صاحبِ طمع اور خوشامدی گروہ ہے جس نے اپنے اغراض کے لیے اربابِ اقتدار کی ہر بے راہ روی اور گمراہی کو دین ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس طرح وہ خود بھی ذلیل ہوا اور اس نے دین کو بھی ذلیل کیا۔ انہی لوگوں کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے۔

قال لو ان اھل العلم صانوا العلم

فرمایا کہ اگر اہل علم اپنے علم کی قدر کرتے اور اس کو اس کے

ووضعوہ عند اہلہ لسادوا بہ اہل زمانہم ولکنہم بذلوہ لاہل الدنیا لینالوا بہ من اہل الدنیا فہانوا علیہم۔

عقیدوں کے سامنے پیش کرتے تو اس کے ذریعہ سے وہ اپنے زمانہ کے لوگوں پر سرداری کرتے لیکن انہوں نے دنیا داروں سے صلہ حاصل کرنے کے لیے اس علم کو ان کی مقصد براریوں کے لیے استعمال کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نگاہوں میں ذلیل ہو کے رہ گئے۔

اسی قسم کے اقتدار پرست اور دین فروش گروہ کا ذکر حضور نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اناسًا من امتی سیتفقہون فی الدین ویقرؤن القرآن یقولون ناتی الامراء فنصیب من دنیاہم ونعتزلہم بدیننا ولا یکون ذالک کما لا یجتنی من القتاد الا الشوک کذالک لا یجتنی من قربہم (مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو فقہ اور تفسیر کا علم حاصل کریں گے۔ پھر وہ کہیں گے کہ اس میں کیا برائی ہے کہ ہم ارباب اقتدار سے مل کے ان کی دنیا سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے دین کو ان سے بچائے رکھیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔ جس طرح ببول کے درخت سے کانٹے کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہو سکتا اسی طرح ارباب اقتدار کے قرب سے (راوی کا خیال ہے) گناہ کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہو سکتا۔

اسی قسم کے خوشامدی اور ارباب اقتدار کی عبادت کرنے والے دین فروشوں کے متعلق حضور نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ اللہ کو سب سے زیادہ مبغوض ہیں اور جب اس قسم کے لوگ پیدا ہونے لگیں گے تو دین کی ساری حقیقت مٹ جائے گی۔ صرف کچھ رسوم اور الفاظ باقی رہ جائیں گے۔ حضور کا ارشاد ہے:۔

ان من ابغض القراء الی اللہ تعالیٰ الذین یزورون الامراء۔ یوشک ان یاتی علی الناس زمان لا یبقی من الاسلام الا اسمہ ولا یبقی من القرآن الا رسمہ الحدیث (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

خدا کے نزدیک سب سے زیادہ بُرے وہ مدعیان علم قرآن ہیں جو ارباب اقتدار کے تقرب کے طلبگار ہیں۔ قریب ہے کہ وہ زمانہ آئے کہ اسلام میں سے صرف اس کا نام باقی رہ جائے اور قرآن میں سے صرف اس کے الفاظ۔

دوسری چیز جو اظہارِ کلمہ حق سے مانع ہوتی ہے وہ خوف ہے۔ یہ خوف مختلف چیزوں کا ہوتا ہے۔ کبھی اس عزت و سیادت کے چھن جانے کا ہوتا ہے جو آدمی کو حاصل ہوتی ہے، کبھی عوام کی برہمی اور خفگی کا اندیشہ ہوتا ہے، کبھی اربابِ اقتدار کے غصہ و غضب اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر کسی آزمائش کے پیش آجانے کا خوف ہوتا ہے۔ اس خوف کو قرآن نے متعدد مقامات میں بڑی وضاحت کے ساتھ منافقین کی صفات میں سے گنایا ہے اور اچھے مسلمانوں کی تعریف اس کے مقابل میں یہ بیان کی ہے۔

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۔ (۵۴۔ مائدہ)

پس عنقریب اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور جو اس سے محبت کریں گے، جو مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے، جو اللہ کے راستہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

اسی حقیقت کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔

لا یمنعن احدا منکم ھیبۃ الناس ان یقول بحق اذا علمہ۔

تم میں سے کسی کے لیے انسانوں کا رعب اس بات سے مانع نہ ہو کہ وہ حق کا اظہار نہ کرے جبکہ وہ اس کو جانتا ہو۔

اسی چیز کو اس مشہور حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے۔

افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔

سب سے زیادہ مبارک جہاد کسی حق سے منحرف صاحب اقتدار کے سامنے کلمہ حق کا کہنا ہے۔

اگر قوم کے اندر اظہارِ حق کا یہ جوہر باقی نہ رہے اور مداہنت اور کتمانِ حق کی بیماری پھیل جائے تو پھر اس کی سزا اس قوم کو یہ ملتی ہے کہ اس کے اندر سے علمِ حق غائب ہو جاتا ہے۔ پچھلی امتوں میں سے یہود و نصاریٰ اس کی نہایت عبرت انگیز مثال موجود ہیں۔

اشتغال بالادنیٰ علمِ حقیقی کی نعمت سے محروم کرنے والی چیزوں میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ دوسرے حقیر علوم کو اس علم پر ترجیح دی جائے اور آہستہ آہستہ یہ بدمذاقی اس قدر بڑھ جائے کہ پھر طبیعت کے اندر اعلیٰ اور

حقیقی علم کے لیے سرے سے کوئی رغبت ہی باقی نہ رہ جائے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جن چیزوں کے پڑھنے پڑھانے سے دنیوی منفعتیں اور عزتیں حاصل ہو سکتی ہیں، یا جن چیزوں کا علم وقت کی سوسائٹی میں شہرت اور حصولِ مقاصد کا ذریعہ بن سکتا ہے، یا جن چیزوں کا مطالعہ لذت اور بے فکری کے ساتھ اوقات گذاری کا سامان فراہم کر سکتا ہے، طبیعتیں انہی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور یہ میلان اس قدر غالب اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جو یا تو نرے قدامت پرست ہوں یا زمانہ کے رجحان عام بلکہ اس کی وبائے عام سے لڑ کر جینے کا دم داعیہ رکھتے ہوں اور کوئی بھی اس بات کی ہمت نہیں کر سکتا کہ اپنا اور اپنی اولاد کا وقت ان چیزوں کے سیکھنے سکھانے پر "ضائع" کرے جو حقیقت کے نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی قدر و قیمت کی حامل ہوں لیکن وقت کے بازار میں ان کی کوئی مانگ نہ ہو۔

پچھلی ملتوں میں سے یہود کے متعلق صاف قرآن میں بیان ہوا ہے کہ جب ان کے اندر کلدانیوں کے علوم — سحر و ساحری — اور صوفیانہ قسم کے علوم مثلاً علم خواص کلمات اور عملیات حب و بغض اور تسخیر جنات و شیاطین کا زور ہوا تو وہ ان میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب پیٹھ پیچھے پھینک دی۔ اس کے سیکھنے سکھانے کے لیے ان کے اندر سرے سے کوئی میلان باقی ہی نہیں رہ گیا۔ چنانچہ قرآن نے ان کا حال یہ بیان کیا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ۔ (۱۰۲ بقرہ)

اور جب ان کے پاس ایک رسول آیا اللہ کی طرف سے سچ ثابت کرنے والا ان پیشینگوئیوں کو جو ان کے پاس موجود تھیں تو ان لوگوں کے اندر سے جن کو کتاب ملی تھی ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا، گویا وہ اس سے واقف ہی نہیں۔ اور پیچھے پڑ گئے ان چیزوں کے جو شیاطین سلیمان کے زمانہ میں پڑھتے پڑھاتے تھے۔

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا۔

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ

پس ان سے سیکھتے تھے وہ علم جس

بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۔

کے ذریعہ سے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی کرا سکیں۔ حالانکہ اس کے ذریعہ سے وہ خدا کے حکم کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور وہ سیکھتے تھے وہ علم جو ان کو نقصان پہنچاتا تھا نفع نہ پہنچاتا تھا۔

یہی صورت مسلمانوں کے اندر اس وقت پیش آئی جب یونانی علوم کا فتنہ پھیلا۔ عباسیوں کے زمانہ میں جب منطق و فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور مسلمانوں نے ان کا پڑھنا پڑھانا شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حال ہو گیا کہ بہتر سے بہتر دینی حلقوں میں بھی قرآن اور حدیث کا علم محض برائے تبرک رہ گیا۔ یہ چیزیں وقت کی سوسائٹی کے دل و دماغ پر اس قدر چھا گئیں کہ وہ شخص پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا تھا جو ان چیزوں کے اندر کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔ اول تو لوگوں میں دین کو پیش کرنے کا ولولہ ہی سرد پڑ گیا۔ لیکن اگر کچھ باقی رہا بھی تو اس کی جرأت بہت کم لوگ کر سکتے تھے کہ دین کو براہِ راست کتاب و سنت کے واسطہ سے پیش کریں بلکہ وہ مجبور ہوئے کہ انہی بولیوں اور انہی اصطلاحات میں بات کریں جو منطق و فلسفہ کے رعب و اثر نے زبانوں پر چڑھا دی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے پیش کرنے کا اصلی ذریعہ علمِ کلام بن گیا جس کو مذہب کی بگڑی ہوئی شکل کہنا تو اس کی غرت افزائی ہو گی۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلسفہ اور منطق اور یونانی علمِ مناظرہ کی ایک مسخ شدہ شکل تھا۔

اسی طرح اربابِ تصوف نے اشراقیت اور ویدانت سے جو تاثر قبول کیا تو اس راہ سے بہت سے فتنے ایسے گھس آئے جو علمِ حقیقی کی رہنمائی سے محروم کرنے والے ثابت ہوئے۔ اور بعد کے زمانوں میں تو ان لوگوں کا بیشتر اعتماد صرف گنڈوں، تعویذوں اور تسخیر و تاثیر کے عملیات پر رہ گیا۔ جس نے ان چیزوں میں کچھ دخل حاصل کر لیا اس کا کاروبار چل گیا اور جو اس میں پیچھے رہے وہ بالکل ہی ناکام ثابت ہوئے۔ بہت ہی تھوڑے لوگ ایسے نکلے جو اس روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی جرأت کر سکے۔

اب اس دورِ آخر میں اس فتنہ کا جو حال ہے اس کا اندازہ ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ کر سکتا ہے کہ

(باقی صـ پر)